رسائل و مسائل

خلافت کے لیے قرشیت کی شرط

سوال: اسلام تمام دنیا کو پیغام دیتا ہے کہ سب انسان بحیثیت انسان ہونے کے برابر ہیں، گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، اسلام کے حرم میں داخل ہوتے ہی سب اونچ نیچ برابر ہو جاتی ہے، اگر کوئی فرق رہتا ہے تو وہ بس اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کے اصول پر رہتا ہے۔ پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے جس کا مفہوم یہ یا اس کے قریب ہے کہ خلافت قریش میں رہنی چاہیے۔ یہ صحیح ہے تو پھر ہٹلر ہی نے کیا برا کیا اگر اپنی قوم کو تمام دنیا کی قوموں پر فائق اور سرداری کا حق دار ٹھیرایا؟ اور پھر اگر ایک قریشی کے لیے یہ حق ہے کہ قریش کو نہ صرف عجم پر بلکہ خود اہل عرب پر بھی فوقیت دے تو آخر معزبی اقوام ہی دوسری قوموں کو کم تر ٹھیرانے میں کیوں حق بجانب نہیں؟ اسلام کی اس دعوت کو حدیث کی اس روایت کے ساتھ کیونکر منطبق کیا جا سکتا ہے؟

جواب: بسا اوقات آدمی ایک خاص ماحول میں خاص موقع و محل پر ایک بات کہتا ہے جو اپنی جگہ بالکل صحیح ہوتی ہے، لیکن جب وہی بات اپنے محل سے الگ کر کے نقل کی جاتی ہے تو اس کی شکل کچھ اور ہی بن جاتی ہے اور اس سے ایسے معنی نکل آتے ہیں جو خود قائل کے منشا کے بالکل خلاف ہوتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ اُس معنی کی احادیث کے ساتھ بھی پیش آیا ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ اسی غلط فہمی میں پڑ کر فقہائے اسلام کے ایک بڑے گروہ نے خلافت کے لیے منجملہ اور شرائط کے قرشیت کو بھی ایک قانونی شرط قرار دے لیا۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا کچھ اور تھا۔

اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم ایک طرف اسلام کے اصولوں کی دعوت و تبلیغ بالکل بے لاگ طریقہ سے فرماتے تھے تو دوسری طرف ایک بالغ النظر مدبر کی حیثیت سے وقت اور سوسائٹی اور ماحول کے واقعی حالات پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے اور ایسی تدابیر عمل میں لانے سے پرہیز فرماتے تھے جو چاہے اصولاً اپنی جگہ صحیح ہوں مگر واقعی حالات کا لحاظ کیے بغیر ان کو عملی جامہ پہنا دینے سے عظیم تر فتنہ رونما ہونے کا اندیشہ ہو۔ آپ نے اُس وقت کے عرب کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھا تھا، اور بالکل ٹھیک سمجھا تھا کہ قریش کا قبیلہ اپنے مردان کار کی قابلیت اور اپنے اُن اثرات کی بنا پر جو اسے صدیوں سے ملک میں حاصل تھے، اتنا طاقت ور قبیلہ ہے کہ اگر اس کی موجودگی میں آپ کے بعد کسی غیر قریشی کو امیر بنا دیا گیا تو وہ کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اسلام کی جمہوری روح آپ نے لوگوں میں پھونک دی تھی اس کی بنا پر عین ممکن تھا کہ مسلمان اس روح کا مظاہرہ کرنے کے لیے آپ کے بعد کسی آزاد کردہ غلام کو خلیفہ بنا لیتے، یا کسی بے اثر قبیلہ کے شیخ کو منتخب کر لیتے۔ لیکن اس وقت ملک کا اجتماعی نظام عملاً جس طرح کا تھا اس کو دیکھتے ہوئے یہ نہایت غلط تدبیر ہوتی۔ اسی وجہ سے آپ نے لوگوں کو سمجھا دیا کہ آپ کا جانشین کوئی قریشی ہونا چاہیے۔

حضورؐ کا یہ اندازہ اس قدر صحیح تھا کہ تاریخ آپ کے بعد صدیوں تک اس کی صحت کا ثبوت دیتی رہی ہے۔ قریش کے قبیلے کی زبردست مردم خیزی کا حال یہ تھا کہ خلافت راشدہ کے دور میں چاروں خلیفہ اسی نے فراہم کیے اور معلوم ہے کہ ان چاروں کی ٹکر کا کوئی آدمی فی الواقع اس وقت عرب میں نہ تھا۔ پھر اسی قبیلے نے عظیم الشان اموی سلطنت قائم کی، اسی نے عباسی سلطنت کو جنم دیا، اسی نے اسپین میں ایک زبردست حکومت کھڑی کر دی، اور اسی نے مصر میں دولت فاطمیہ کی تاسیس کی۔ ایسی زبردست قابلیتوں اور اثرات کے مالک قبیلہ کی موجودگی میں اگر عملی سیاست کو نظر انداز کر کے محض نظری سیاست کا مظاہرہ کیا جاتا تو نتیجہ خلافت کی ناکامی کی صورت میں نکلتا۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا وہ قانونی حیثیت سے نہ تھا کہ از روئے شرع خلیفہ کو قریشی ہونا چاہیے اور غیر قریشی کو خلافت کا حق ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ عملی سیاست کے لحاظ سے ایک ہدایت تھی۔ اور

ساتھ ہی آپ نے یہ پیشگوئی بھی کر دی تھی کہ جب تک قریش اپنے اخلاق بلند رکھیں گے اور فی الجملہ دین کی علمبرداری کرتے رہیں گے اور ان میں دو آدمی بھی مردان کار پائے جائیں گے ریاست انہی کو حاصل رہے گی۔

یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں، احادیث کے تتبع سے اس کی پوری وضاحت ہو سکتی ہے۔

مسند احمد میں عمرو بن عاص کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا قریش قادۃ الناس، "قریش اہل عرب کے لیڈر ہیں"۔ بیہقی میں حضرت علی کی روایت اس معنی پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں حضور صلعم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ کان ھذا الامر فی حمیر فنزعہ اللہ منھم وجعلہ فی قریش "پہلے عرب کی سرداری حمیر والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ نے ان سے چھین کر قریش کو دیدی"۔ دوسری روایات میں اس مضمون کی اور زیادہ تشریح ملتی ہے، مثلاً الناس تبع لقریش فی الخیر والشر، "بھلائی ہو یا برائی، دونوں راستوں میں اہل عرب قریش ہی کے پیچھے چلتے ہیں"۔ برالناس تبع لبرھم وفاجرھم تبع لفاجرھم "اچھے لوگ قریش کے اچھوں کی اور بدکار لوگ قریش کے بدکاروں کی پیروی کرتے ہیں"۔ الناس تبع لقریش فی ھذا الشان، مسلمھم لمسلمھم وکافرھم لکافرھم "اہل عرب سرداری قریش ہی کی مانتے ہیں، مسلمان قریش کے مسلمانوں کی پیروی کرتے ہیں اور کافر قریش کے کافروں کی"۔ اسی مضمون کو حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنی سقیفہ بنی ساعدہ والی تقریر میں بیان فرمایا تھا کہ فاما العرب فلن تعرف ھذا الامر الا لھذا الحی من قریش، "اہل عرب تو قبیلہ قریش کے سوا کسی اور کی سرداری سے آشنا ہی نہیں ہیں"۔ یہ سب کچھ بیان واقعہ ہے۔ جو کچھ اُس وقت عرب کے واقعی حالات تھے اور صدیوں کی تاریخ نے جو حقیقی صورت حال پیدا کر دی تھی، وہی ان روایات میں بیان کر دی گئی ہے۔ ان میں کہیں بھی کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ معنی نکلتے ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ قریش سردار ہوں۔ بلکہ اس واقعہ کو بطور ایک واقعہ کے بیان کیا گیا ہے کہ قریش ملک کے سردار ہیں۔ یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے بہت پہلے وجود میں آچکا تھا، ساری قوم کے نفسیات پر یہی لوگ چھائے ہوئے تھے، زندگی کے ہر پہلو میں

یہ آگے تھے اور قوم ان کے پیچھے چلتی تھی۔ پھر جب کہ کفر کی طرح اسلام میں بھی یہی پیش پیش رہے اور انہی کے اثر سے اہل عرب نے اس دین کو قبول کیا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کی اس واقعی اور تاریخی سرداری کے خلاف جنگ کرنے اور اسے بدلنے کی کوشش میں خواہ مخواہ قوت ضائع کی جاتی۔ اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کو ہدایت فرمائی کہ اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے زمانۂ اسلام میں بھی قریش کو سرداری کے مرتبہ پر قائم رہنے دو۔ قدموا قریشا ولا تقدموھا "قریش کو آگے رکھو، ان کے مقابلہ میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔"

پھر آپ نے متعدد مواقع پر اس بات کی بھی صراحت فرما دی کہ قریش اس مرتبہ پر اس وقت تک سرفراز رہیں گے جب تک ان میں سرداری کی صلاحیت رہے گی اور جب تک وہ اس دین کو قائم رکھیں گے۔

ان ھذا الامر فی قریش لا یعادیھم احد الا کبہ اللہ علی وجھہ ما اقاموا الدین۔

یہ سرداری قریش میں باقی رہے گی اور جو ان کا مقابلہ کرے گا اللہ اس کو منہ کے بل گرا دیگا جب تک وہ اس دین کو قائم کرتے

الائمۃ من قریش ما اذا حکموا فعدلوا ووعدوا وفوا واسترحموا

سردار قریش ہی میں سے ہوتے رہیں گے جب تک وہ اپنے حکم میں انصاف اور اپنے وعدوں کو وفا اور خلق اللہ پر رحم کرتے رہیں گے۔

لا یزال ھذا الامر فی قریش ما بقی منھم اثنان

یہ سرداری قریش میں رہے گی جب تک ان میں دو مرد ان کا بھی باقی رہیں گے۔

ان ارشادات میں صریح طور پر یہ بات متضمن ہے کہ جب قریش اپنی اس اہلیت کو کھو دیں گے تو سرداری ان سے نکل جائے گی اور غیر قرشی بلکہ غیر اہل عرب تک سردار و پیشوا بن جائیں گے۔ اگر اسلامی شریعت میں از روئے ضابطہ خلافت صرف قریش ہی کا حق ہوتی اور غیر قرشی کو کسی صورت میں یہ حق پہنچا ہی نہیں تو یہ بات آخر کیسے کہی جا سکتی تھی۔

حضرت علی کی امیدواری خلافت؟

سوال: جماعت اسلامی کے ارکان بالعموم موجودہ زمانہ کے جمہوری طریقوں پر جو تنقیدیں کرتے

ہیں ان میں منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ جو شخص خود کسی منصب یا عہدے کا امیدوار ہو یا اس کا دعویدار بنے، اسلام کی رو سے وہ اس کا مستحق نہیں ہے کہ اسے منتخب کیا جائے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی جو خلافت کے امیدوار یا دعویدار تھے اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟

جواب: حضرت علی کی امیدواری و دعویداری کا قصہ دراصل ایک بڑے قصے کا جزء ہے جس کی بنا بعض مخصوص روایات پر قائم ہے۔ اس جزء کو کل سے الگ کر کے تنہا اسی پر بحث کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ اگر آپ اس جزء کو مانتے ہیں تو اس پورے قصے کو ماننا پڑے گا جس کا جزء یہ ہے اور پھر اس پر بحث کرنی ہوگی۔

اس قصے کی روایات بہت مشہور ہیں۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں سقیفۂ بنی ساعدہ کے بعد کے واقعات کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اور ابن قتیبہ اپنی الامامۃ والسیاسۃ میں جو نقشہ کھینچتا ہے، اور ایسے ہی دوسرے لوگ جو روایات اس سلسلہ میں بیان کرتے ہیں، وہ سب آپ کے سامنے موجود ہیں۔ اگر آپ اس تاریخ کو باور کرتے ہیں تو پھر آپ کو محمد رسول اللہ ــــ مبلغ قرآن، داعی اسلام، مزکی نفوس ــــ کی شخصیت پر اور ان کی تعلیم و تربیت کے تمام اثرات پر خط نسخ کھینچ دینا پڑے گا اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس پاکیزہ ترین انسان کی ۲۳ سالہ تبلیغ و ہدایت سے جو جماعت تیار ہوئی تھی، اور اس کی قیادت میں جس جماعت نے بدر و احد اور احزاب و حنین کے معرکے سر کر کے اسلام کا جھنڈا دنیا میں بلند کیا تھا، اس کے اخلاق، اس کے خیالات، اس کے مقاصد، اس کے ارادے، اس کی خواہشات، اور اس کے طور طریق عام دنیا پرستوں سے ذرہ برابر بھی مختلف نہ تھے۔

اس تاریخ میں ہمارے سامنے کچھ اس طرح کا نقشہ آتا ہے کہ ایک حوصلہ مند شخص نے کئی سال کی جانفشانی سے لڑ بھڑ کر ایک ملک فتح کیا تھا اور اپنے زور بازو سے ایک سلطنت قائم کر لی تھی۔ پھر قضائے الٰہی سے اس نے وفات پائی۔ اس کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے رفیقوں اور ساتھیوں نے، جو سب کے سب اسی کے بنائے ہوئے آدمی تھے، اور جن پر وہ تمام عمر اعتماد کرتا رہا، یکایک آنکھیں پھیر لیں۔

ابھی اس کے گھر والے اس کی تجہیز و تکفین ہی میں مشغول تھے کہ اس کے ساتھیوں کو یہ فکر پڑ گئی کہ کسی طرح تخت شاہی پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ وہ جمع ہوئے اور پہلے آپس میں جھگڑا کرتے رہے۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ یہ لقمۂ تر میرے منہ میں آئے۔ آخر بڑی ردّ و کد کے بعد انھوں نے اپنے میں سے ایک کو بادشاہی کے لیے منتخب کر لیا۔ یہ کارروائی جب مکمل ہو گئی تو بانی سلطنت کے خاندان والوں کو اس کی خبر پہنچی اور ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مرحوم کا بیٹا تو کوئی تھا نہیں۔ ایک داماد تھا۔ وہ بپھر گیا کہ میرے ہوتے اور کون وارث تاج و تخت ہو سکتا ہے۔ بیٹی بھی پیچ و تاب کھانے لگی کہ جو سلطنت اس کے باپ نے برسوں کی جانفشانی سے قائم کی تھی اس پر دوسروں کو قبضہ کر لینے کا کیا حق ہے۔ پہلے تو خاندان والے آپس میں سر جوڑ کر مشورے کرتے رہے۔ پھر انھوں نے مرحوم بادشاہ کے پرانے پرانے ساتھیوں کو اس کے احسانات یاد دلا دلا کر اپیل کرنے شروع کیے اور پبلک میں اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ مرحوم کا داماد اس کی بیٹی کو دارالسلطنت کے محلوں میں لیے لیے پھرتا رہا اور ایک ایک با اثر قبیلے میں اسے لے گیا تاکہ شاید اسی کی فریاد سے لوگوں کے دل پگھل جائیں۔ مرحوم بادشاہ کی قبر کو بھی خطاب کر کر کے دہائیاں دیں کہ شاید یہی اپیل کارگر ہو جائے۔ مگر کسی نے سن کر نہ دی۔ آخر بیچارہ تھک ہار کر بیٹھ رہا، اور جب مرحوم کی بیٹی بھی، جو اس کے دعوے کی اصل بنیاد تھی، دنیا سے رخصت ہو گئی، تو اس غریب نے جا کر بادل ناخواستہ غاصب تخت کی اطاعت قبول کر لی، مگر دل میں وہ برابر پیچ و تاب کھاتا رہا اور وقتاً فوقتاً اپنے اس پیچ و تاب کا اظہار بھی کسی نہ کسی طرح کرتا رہا۔

کیا واقعی یہی تصویر ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل بیتؓ اور ان کے اصحابؓ کبار کی؟ کیا اللہ کے رسول کی یہی پوزیشن تھی کہ وہ دنیا کے عام بانیان سلطنت کی طرح ایک سلطنت کا بانی تھا؟ کیا پیغمبر خدا کی ۲۳ سالہ تعلیم، صحبت اور تربیت سے یہی اخلاق، یہی سیرتیں اور یہی کردار تیار ہوئے تھے؟ آخر اس نقشے کو کیا مناسبت ہے قرآن اور اس کی پاکیزہ ترین تعلیمات سے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی اُن بلند ترین اخلاقی ہدایات سے جو ذخیرۂ حدیث میں بھری پڑی ہیں؟ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے اُن سوانح حیات سے جن میں (اس ایک قصے کے سوا) دنیا طلبی کا کوئی

شائبہ تک نظر نہیں آتا؟ ابوبکرؓ و عمرؓ کی ان زندگیوں سے جن کا کوئی رنگ بھی دنیا کے بھوکے لوگوں کے رنگ ڈھنگ سے نہیں ملتا؟ اور صحابہ کرام کی ان سیرتوں سے جن کے مجموعے میں اس وار تان کے کھینچے ہوئے نقشے کو رکھ کر دیکھا جائے تو کسی طرف سے بھی اس کا جوڑ ان کے ساتھ بیٹھتا نظر نہیں آتا؟ پھر اگر اس گروہ کی تاریخ کا پورا مستند ذخیرہ ہمارے سامنے اس کے اخلاق، اس کی سیرت، اس کی ذہنیت اور اس کے نفسیات کا کچھ اور نقشہ پیش کرتا ہے اور صرف ایک مجموعۂ روایات اس کے بالکل برعکس ایک اور ہی نقشہ پیش کر رہا ہے تو آخر عقل کیا کہتی ہے؟ کیا یہ کہ سمندر میں "اتفاقاً" آگ لگ گئی تھی؟ یا یہ کہ سمندر میں پانی تھا ہی نہیں، آگ ہی آگ تھی؟ یا یہ کہ آگ لگنے کا قصہ جھوٹا ہے، جب تمام شہادتیں اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ وہ سمندر تھا تو وہاں پانی کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا؟ تاہم اگر کسی کا جی چاہتا ہے کہ اس قصے کو باور کرے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔ تاریخ کے صفحات تو بہرحال اس سے آلودہ ہی ہیں۔ مگر پھر ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ معاذ اللہ معاذ اللہ رسالت کا دعویٰ محض ایک ڈھونگ تھا، قرآن شاعرانہ لفاظی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور تقدس کی ساری داستانیں خالص ریاکاری کی داستانیں تھیں، اصل میں تو ایک شخص نے ان چالوں سے دنیا کو پھانسا تھا تاکہ اپنی ایک سلطنت بنائے اور اس قسم کے دنیا طلب مکاروں کے گرد جیسے لوگ جمع ہوا کرتے ہیں ویسے ہی لوگ اس کے گرد بھی جمع ہو گئے تھے اور تقدس کے اس ظاہری پردے میں دراصل وہ جن مقاصد کے لیے کام کر رہا تھا ان کا راز آخر کار اس کے اپنے گھر والوں نے فاش کر کے رکھ دیا۔

اس کے مقابلہ میں تاریخ کچھ اور روایات بھی پیش کرتی ہے۔ ذرا ان کو بھی دیکھ لیجیے۔ علامہ ابوجعفر ابن جریر طبری پوری سند کے ساتھ یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعید بن زید سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعات پوچھے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بیان کیا:

ان علی ابن ابی طالب کان فی بیتہ اذ جاءہ من انباہ ان ابابکر قد جلس للبیعۃ۔ فخرج فی قمیص لہ ما علیہ	علی ابن طالب اپنے گھر میں تھے کہ ایک شخص نے ان کو جا کر خبر دی کہ ابوبکر بیعت لینے کے لیے بیٹھے ہیں۔ یہ سن کر وہ چادر اور ازار کے بغیر نرے قمیص ہی میں نکل

ازار ولا رداء عجلا کراھیۃ ان یبطی عنھا
حتی بایعہ، ثم جلس الیہ وبعث الی
ثوبہ فاتاہ فتجللہ ولزم مجلسہ

کھڑے ہوئے۔ اتنی دیر کرنی بھی انھوں نے پسند نہ کی کہ کپڑے
پہن لیں۔ پہلے جاکر بیعت کی، پھر گھر سے کپڑے منگائے
اور پہن کر مجلس میں بیٹھے۔

بیہقی کی روایت اس سے تھوڑی مختلف ہے۔ وہ ابوسعید خدری سے روایت کرتے ہیں کہ:

فصعد ابوبکر المنبر فنظر فی وجوہ
القوم فلم یر الزبیر قال فدعا بالزبیر
فجاء، فقال قلت ابن عمۃ رسول اللہ و
حواریہ، اردت ان تشق عصا المسلمین؟ فقال
لا تثریب یا خلیفۃ رسول اللہ، فقام فبایعہ۔
ثم نظر فی وجوہ القوم فلم یر علیا فدعا بعلی
بن ابی طالب، فجاء، فقال قلت ابن عم
رسول اللہ وختنہ علی ابنتہ، اردت ان
تشق عصا المسلمین؟ قال لا تثریب
یا خلیفۃ رسول اللہ فبایعہ۔

پھر ابوبکر منبر پر چڑھے اور حاضرین مجلس پر نظر ڈالی۔ دیکھا
کہ زبیر موجود نہیں ہیں۔ ان کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا جب
وہ آئے تو فرمایا، میں کہہ رہا تھا کہ رسول اللہ کے پھوپھی زاد
بھائی اور حضور کے حواری کہاں ہیں۔ کیا تم مسلمانوں کی جماعت
سے الگ رہنا چاہتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا اے جانشین
رسول معاف فرمایئے، پھر اٹھے اور بیعت کی۔ پھر ابوبکر نے
مجمع پر دوبارہ نظر ڈالی اور دیکھا کہ علی نہیں ہیں۔ انھیں بلانے
کے لیے بھی آدمی بھیجا جب وہ آگئے تو فرمایا، میں کہہ رہا تھا کہ
رسول اللہ کے چچا زاد بھائی اور داماد کہاں رہ گئے، کیا تم
مسلمانوں کی جماعت سے الگ رہنا چاہتے تھے؟ انھوں
نے بھی فرمایا کہ اے جانشین رسول! معاف فرمایئے۔ پھر بیعت کی۔

ان دونوں روایتوں میں بظاہر جو تھوڑا سا اختلاف نظر آتا ہے وہ محض تفصیل کا فرق ہے، ورنہ
در اصل دونوں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ پھر اس کی مزید تائید حضرت عبدالرحمٰن بن عوف
کی اس روایت سے ہوتی ہے جو موسیٰ بن عقبہ نے عمدہ سند کے ساتھ اپنے مغازی میں نقل کی ہے:

ثم خطب ابوبکر واعتذر الی
الناس وقال ماکنت حریصا علی الامارۃ
یوما ولا لیلۃ ولا سألتھا فی سر ولا علانیۃ

پھر ابوبکر نے (بیعت کے بعد) خطبہ دیا اور اپنی معذرت پیش
کرتے ہوئے فرمایا "میرے دل میں ایک دن یا ایک رات
کے لیے بھی امارت کی ہوس نہ تھی، اور نہ میں کبھی خفیہ یا علانیہ

فقبل المهاجرون مقالته وقال علی والزبیر ما غضبنا الا لانا اخرنا عن المشورة وانا نری ابابکر احق الناس بها، انه لصاحب الغار وانا لنعرف شرفه وخیرہ ولقد امرہ رسول اللہ ان یصلی بالناس وھو حی

اس کی خواہش کی"۔ سب مہاجرین نے حضرت ابوبکر کی اس تقریر کو خاموشی سے سنا۔ البتہ علی اور زبیر نے اتنا کہا کہ ہم کو شکایت صرف اس بات کی ہے کہ ہمیں مشورہ میں شریک نہیں کیا گیا، ورنہ ہم بھی ابوبکر کو سب سے زیادہ مستحق سمجھتے ہیں، وہ رسول اللہ کے رفیق غار ہیں۔ ان کے شرف اور ان کی تجربہ کاری کا ہمیں اعتراف ہے اور رسول اللہ نے اپنی زندگی میں انہی کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لیے کھڑا کیا تھا۔

پھر علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں اپنی یہ تحقیق پیش کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہؓ کے پاسِ خاطر سے چھ مہینے تک خانہ نشین رہے، کیونکہ وہ تقسیم میراث کے معاملہ میں حضرت ابوبکر سے ناراض ہو گئی تھیں، اور حضرت علی نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے جو داغ ان کے دل کو لگا ہے اس پر کسی ادنیٰ وجہ ملال کا بھی اضافہ ہو۔ بعد میں جب حضرت فاطمہ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علی نے دوبارہ حاضر ہو کر حضرت ابوبکر سے بیعت کی تجدید کی اور معاملات میں حصہ لینا شروع کیا۔[1]

ہم خواہ مخواہ کسی کے ساتھ بحث و مناظرے میں نہیں الجھنا چاہتے۔ ہم نے یہ دونوں تصویریں پیش کر دی ہیں۔ اب ہر صاحب عقل کو خود سوچنا چاہیے کہ ان میں سے کونسی تصویر مبلغِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت و اصحاب کبار کی سیرتوں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اگر پہلی تصویر پر کسی کا دل ان ریجھتا ہو تو ریجھے، مگر اس کے ساتھ ایک امیدواری و دعویداری کا مسئلہ ہی نہیں، پورے دین و ایمان کا مسئلہ حل طلب ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی اس دوسری تصویر کو قبول کرے تو اس میں سرے سے اس واقعہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے کہ حضرت علی منصب خلافت کے امیدوار یا دعویدار تھے۔

---

[1] ایک اور روایت محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب "الصدیق" میں نقل کی ہے جس کی تحقیق کا مجھے موقع نہیں ملا۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر کی بیعت ہو گئی تو جناب ابوسفیان نے حضرت علی کو دعویداری خلافت کے لیے اکسانے کی کوشش کی تھی، مگر حضرت علی نے ان کو جواب دیا کہ تمہاری عمر کا ایک بڑا حصہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی میں گزر چکا ہے، اب اپنے سابق نامۂ اعمال میں کچھ اور اضافہ نہ کرو تو بہتر ہے۔ میرے نزدیک ابوبکر اس منصب کے اہل ہیں جو انھیں دیا گیا ہے۔

اسلام بلا جماعت

سوال: جو شخص آپ کی جماعت کے اصولوں کے مطابق حتی المقدور صحیح اسلامی زندگی بسر کر رہا ہو، وہ اگر بعض اسباب کے تحت باقاعدہ جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اس کے متعلق میرا وہی خیال ہے جو احادیث سے ثابت ہے، یعنی صحیح اسلامی زندگی بغیر جماعت کے نہیں ہوتی۔ صحیح اسلامی زندگی کے لیے سب سے مقدم چیز اسلام کے نصب العین سے وابستگی ہے۔ اس وابستگی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اس نصب العین کے لیے جدوجہد کرے۔ اور یہ جدوجہد اجتماعی طاقت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جماعت کے بغیر کسی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی سمجھنا بالکل غلط ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص ہماری اس جماعت میں شامل نہ ہو اور کسی دوسری جماعت سے اس کا تعلق ہو جس کا نصب العین اور نظام جماعت اور طریق جدوجہد اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو۔ اس صورت میں ہمیں اس کو برسرِ ہدایت ماننے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ لیکن یہ کسر سے اس کی کوئی جماعت ہی نہ ہو اور وہ محض انفرادی طور پر ان طریقوں کی پابندی کرتا رہے جو شخصی کردار کے لیے شریعت میں بتائے گئے ہیں، ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے، اور ہم اس کو کم از کم اسلامیت کی زندگی سمجھتے ہیں۔ اسلامیت کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ اگر آدمی کو اپنے گرد و پیش ایسی کوئی جماعت نظر نہ آتی ہو جو اسلام کے اجتماعی مقصد "اقامت دین" کے لیے اسلامی طریق پر سعی کرنے والی ہو، تو اسے سچے دل سے ایسی ایک جماعت کے وجود میں لانے کی سعی کرنی چاہیے اور اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ جب ایسی جماعت پائی جائے تو اپنی انانیت چھوڑ کر صحیح جماعتی ذہنیت کے ساتھ اس میں شامل ہو جائے۔

علم ظاہر اور علم باطن

سوال: اسلاف کی کتب پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "علم باطنی" ایک ایسا علم ہے جو قرآن

وحدیث اور فقہ وغیرہ علوم سے جدا محض سخت ریاضات و مجاہدات سے حاصل ہو سکتا ہے، چنانچہ امت مسلمہ میں بکثرت انسان ایسے ہوئے ہیں جن کی زندگیوں میں یہ ترتیب ملتی ہے کہ پہلے انھوں نے کتاب و سنت اور فقہ و کلام وغیرہ علوم کی تحصیل کی اور ان کو "علم ظاہری" کا خطاب دیا۔ اس کے بعد "علوم باطنی" کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے لیے سخت سے سخت ریاضتیں کیں تب کہیں جا کر انھیں "روحانی علوم" حاصل ہوئے، اور ان کو انھوں نے ہمیشہ علوم ظاہری پر ترجیح دی۔ براہ کرم کچھ اس پر روشنی ڈالیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے علم باطنی کی کیا تعریف ہے؟ اس کی حقیقت کیا تھی اور اس میں کتنی رنگ آمیزیاں ہوئیں؟ کیا یہ علم ریاضات و مجاہدات کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا؟ اور یہ کہ کیا علوم ظاہری کی تحصیل کے بغیر بھی یہ علم حاصل ہو سکتا ہے؟

جواب: آپ کا سوال بہت تفصیل طلب ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر میں بارہا اپنے مضامین میں روشنی ڈال چکا ہوں، اگرچہ براہ راست اس خاص موضوع پر کچھ نہیں لکھا ہے۔ ظاہر سے مراد اگر احکام ہوں اور "باطن" سے مراد حکمت دین ہو، نیز ظاہر سے مراد اگر احکام شرعی کی تعمیل ہو اور باطن سے مراد اُس اعتقادی و اخلاقی روح کا سمجھنا اور اپنے نفس اور سیرت و کردار میں اُسے جاری و ساری کرنا ہو جو احکام شرعی کی تعمیل میں درحقیقت مطلوب ہے، تو ظاہر و باطن کی یہ تفریق صحیح ہے۔ لیکن اس تفریق کے لحاظ سے باطن کا منبع بھی وہی ہے جو ظاہر کا منبع ہے یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔ اور اس باطن کے لیے تلاوت قرآن، مطالعہ سیرت پاک، اور صوم و صلوٰۃ اور دوسرے احکام شریعت کی پابندی کے سوا کسی اور مجاہدہ و ریاضت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر باطن سے مراد وہ فلسفے ہیں جو تصوف کے نام سے مسلمانوں میں رائج ہوئے تو ان کا منبع قرآن و سنت نہیں ہیں، بلکہ افلاطون اور فلاطینوس اور ویدانت وغیرہ کی تعلیمات ہیں۔ اور جو مشقیں اور ریاضتیں اس غرض سے کی جاتی ہیں کہ ان فلسفوں کے مطابق حقیقت کا مشاہدہ حاصل ہو، نیز خوارق اور کشف اور عجائب کے صدور کی قوت حاصل ہو، ان کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں ہے، چاہے ان باعمال کی بعض شکلیں اسلامی عبادات کی شکلوں سے ملتی جلتی ہوں، اور اس فن کی

بعض اصطلاحات اسلامی لغت سے مستعار لے لی گئی ہوں۔

امانت، قرض، صلۂ رحمی

سوال: (۱) امانت رکھنے اور رکھوانے والے کو کیا کیا اصول ملحوظ رکھنے چاہئیں؟

(۲) قرض حسنہ دینے اور لینے میں کن امور کا لحاظ ضروری ہے؟

(۳) صلۂ رحمی کا مفہوم کیا ہے اور شریعت میں اس کی اہمیت کس حد تک ہے؟

جواب: (۱) امانت اصل میں دو آدمیوں کے درمیان باہمی اعتماد کی بنا پر ہوتی ہے۔ جو شخص کسی کے پاس کوئی امانت رکھتا ہے وہ گویا اس پر یہ اعتماد کرتا ہے کہ وہ پوری ایمانداری کے ساتھ اس کی امانت کی حفاظت کرے گا، اور جو شخص اس امانت کو اپنی حفاظت میں لینا قبول کرتا ہے وہ بھی امانت رکھنے والے پر یہ اعتماد کرتا ہے کہ وہ ایک جائز قسم کی امانت اس کے پاس رکھ رہا ہے، کوئی چوری کا مال یا خلاف قانون چیز نہیں رکھ رہا ہے، نہ اس امانت کے ذریعہ سے کسی قسم کا دھوکا یا فریب کرکے اسے نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پس دونوں پر اس کے سوا کسی اور چیز کی پابندی لازم نہیں ہے کہ وہ اس اعتماد کا پورا پورا حق ادا کریں۔

(۲) قرض دینے اور لینے میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ حتی الامکان فریقین کے درمیان شرائط قرض صاف صاف طے ہوں، مدت کا تعین ہو جائے، تحریر اور شہادت ہو۔ جو شخص قرض دے وہ اس قرض کے بدلے سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے اور مقروض کو احسان رکھ کر اذیت پہنچانے کی بھی کوشش نہ کرے، نیز اگر مدت گذر جائے اور فی الواقع مقروض شخص قرضہ ادا کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کو جہاں تک ممکن ہو مہلت دے اور اپنے قرض کی وصولی میں زیادہ سختی نہ کرے۔ دوسری طرف قرض لینے والے کے لیے یہ لازم ہے کہ جس وقت وہ قرض ادا کرنے کے قابل ہو اسی وقت اس کو ادا کر دے اور جان بوجھ کر ادائے قرض میں تساہل یا ٹال مٹول نہ کرے۔

(۳) صلۂ رحمی کا مفہوم رشتہ داری کے تعلق کی بنا پر ہمدردی، معاونت، حسن سلوک، خیر خواہی اور جائز حدود تک حمایت کرنا ہے۔ اس کی کوئی حد نہ مقرر ہے، نہ کی جا سکتی ہے۔ دراصل یہ عام معروفات

میں سے ہے جنھیں لوگ خود ہی جانتے ہیں۔ اور صلۂ رحمی میں کوتاہی کرنا یا قطع رحمی کرنا ان بڑے گناہوں میں سے ہے جن کی سخت مذمت قرآن و حدیث میں آئی ہے۔

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

سوال: ہماری بستی میں ایک صاحب ہیں جو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دوسرے احکام اسلامی کے پابند ہیں، گناہ کبیرہ سے پرہیز کرنے والے ہیں، مگر ان کا کچھ عجیب حال ہے۔ مثلاً وہ والدین کی خدمت تو سرانجام دیتے ہیں اور ان کے کام میں بھی مدد کرتے ہیں، مگر ان کی املاک سے کچھ نہیں لیتے، حتیٰ کہ ان کا کھانا تک نہیں کھاتے، محض اس بنا پر کہ ان کے والد کاروبار کے فروغ کے لیے جھوٹ بولتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے تمام عزیز و رشتہ دار جن کی کمائیوں میں انھیں حرام آمدنی کے شامل ہونے کا شبہہ ہوتا ہے، ان کے ہاں بھی کھانے پینے سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ رشوت خوروں، سرکاری ملازموں، سودی لین دین کرنے والوں اور فرائض منصبی کی انجام دہی میں بد دیانتی کرنے والوں سے بھی ان کا یہی معاملہ ہے۔ حد یہ کہ ایک امام مسجد ہیں جن کو ناجائز کمائی کرنے والے بعض اصحاب وظیفہ دیتے ہیں۔ یہ صاحب ان کے ہاں بھی کھانے یا چائے وغیرہ میں شریک نہیں ہوتے۔ اگر کبھی سفر میں مجبوراً کسی ایسے شخص کے ہاں کھانا کھا لینے کی نوبت آئے تو یہ کھانے کی قیمت کا اندازہ کرکے اس سے زیادہ قیمت کا کوئی ہدیہ وہاں روانہ کر دیں گے۔ اور اگر کسی ناجائز کمائی کرنے والے کے ہاں مجبوراً کچھ کھا پی لینگے تو اندازاً اس کا معاوضہ خیراتی فنڈ میں جمع کرکے یہ دعا کریں گے کہ یا اللہ اس کا ثواب فلاں کو پہنچے جس کے ہاں میں نے کھایا پیا ہے۔ اس سارے معاملہ کی اُس دوسرے شخص کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔

خود ان مسلم متقی صاحب کی آمدنی ایک قطعی جائز تجارت سے ہوتی ہے جس میں یہ کوئی جھوٹ نہیں بولتے۔ اس کمائی سے اعزہ اور احباب کو کھانے اور چائے کی دعوت اکثر دیتے رہتے ہیں۔ اب ان کی اس پرہیزگاری سے ان کے والدین اور دوسرے اعزہ سخت نالاں ہیں، پڑوسیوں میں بھی ایک ہل چل مچ گئی ہے اور بستی میں ان کے خلاف ناراضی پیدا ہو رہی ہے۔ مہربانی کرکے ہمیں

یہ بتایئے کہ یہ متقی صاحب صحیح راستہ پر ہیں یا نہیں؟ ان کی روش قرآن و حدیث کی حدود کے اندر ہے یا متجاوز؟ اور ان کا یہ تقویٰ ٹھوس اصولی ہے یا فروعی یا مستحب کہیں ایسا تو نہیں کہ انھیں ان کے نفس نے فریب دیا ہو؟

جواب: آپ کا سوال پڑھ کر بڑا تعجب ہوا۔ بجائے اس کے کہ آپ کی بستی کے لوگ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے کہ ان کے درمیان ایک نیک بندہ ایسا ہے جو خود حلال کی کمائی کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی نیکی کی تلقین کرتا ہے اور اگر دوسرے لوگ حرام رزق یا مشتبہ رزق کھانے والے ہیں تو وہ اپنے آپ کو اس ناپاکی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، نیز بجائے اس کے کہ لوگ اس کی زندگی سے سبق لیتے اور خود اس کے ماں باپ اور رشتہ دار شکر بجالاتے کہ ان کے گھر میں ایسا ایک پرہیزگار مرد خدا پیدا ہوا ہے، بستی کے لوگ اور ماں باپ اور اقربا الٹے اس سے بگڑتے ہیں اور اس کے متعلق پوچھ رہے ہیں کہ اس کی یہ پرہیزگاری کیسی ہے۔ وہ اگر اعتدال سے زیادہ سختی بھی کر رہا ہے تو اس کی زیادتی نیکی کی طرف ہے نہ کہ برائی کی طرف۔ آپ لوگوں کو اسکی پرہیزگاری کے متعلق پوچھنے کے بجائے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ جو لوگ تجارت جیسے پاک ذریعۂ رزق کو بھی جھوٹ سے ناپاک کر لیتے ہیں اور جو لوگ رشوت اور ظلم اور ایسے ہی دوسرے حرام ذرائع سے روزی حاصل کرتے ہیں ان کی یہ ناپرہیزگاری کیسی ہے! قصوروار کون زیادہ ہے؟ وہ جو ان گندگیوں سے خود بچتا ہے اور دوسروں کو بچانا چاہتا ہے یا وہ جو ان گندگیوں میں خود مبتلا ہوتے ہیں اور بچنے والے کو الٹی ملامت کرتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں کی اخلاقی پستی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ان کی بستیوں میں خدا کا قانون توڑنے والے مزے سے دندناتے پھرتے ہیں اور رب العالمین کے قانون کی پابندی کرنے والے اور اس کی اطاعت کی تلقین کرنے والے الٹے نکو بن جاتے ہیں۔ متعفن فضا میں اگر کہیں سے خوشبو کی ایک ذرا سی لپٹ آ رہی ہو تو تندرست دماغ اسکی طرف لپکتے ہیں اور ان کا جی چاہتا ہے کہ ساری فضا ہی ایسی ہو جائے۔ لیکن ماتم کے قابل ہے ان بیمار دماغوں کا حال جو خوشبو کی اس لپٹ پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ فضا میں اتنی سی خوشبو بھی باقی نہ رہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ فضا کی عفونت نے ان دماغوں کو اندر تک سڑا دیا ہے حتیٰ کہ اب ان کے لیے بدبو گوارا ہو گئی ہے اور خوشبو ناگوار۔